بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اِشارات

ہٹلر کے مشہور ساتھی ڈاکٹر گوئبلز نے ایک مرتبہ پروپگنڈے کے فن پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا تھا کہ جھوٹی بات اس قدر کثرت کے ساتھ دُہراتے رہو کہ عوام آخر کار یہ سمجھنے لگیں کہ شاید یہ درست ہی ہے۔ گوئبلز اس نسخے کو آزما کر کہاں تک کامیاب ہوا، اسے ہر وہ شخص جانتا ہے جو زمانہ قریب کی تاریخ سے معمولی واقفیت بھی رکھتا ہے۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس غیر اخلاقی طرزِ عمل کا حسرتناک انجام دیکھ لینے کے باوجود دورِ جدید میں کسی فرد، گروہ، قوم یا ملک کو رُسوا اور بدنام کرنے کے لیے یہی حربہ بار بار استعمال کیا جاتا ہے۔ ماہرینِ پروپگنڈا یہ سمجھتے ہیں کہ اپنے مخالف پر اگر اندھا دھند کیچڑ اُچھالی جائے تو اس کا کچھ حصّہ تو اس کے جسم پر ضرور چپک ہی جائے گا۔

جماعت اسلامی کے خلاف جس قسم کی غلط فہمیاں پھیلائی گئی ہیں ان کا اگر غیر جانبداری سے تجزیہ کیا جاتے تو معلوم ہوگا کہ ان کا کچھ حصّہ تو جماعت کے مقصد، موقف، اس کے طریق کار سے لاعلمی کا نتیجہ ہے، مگر بیشتر غلط فہمیاں وہ ہیں جن کو پیدا کرنے اور پھیلانے میں گوئبلز کا یہی نظریہ کار فرما ہے۔

جن شکوک و شبہات کو جماعت اسلامی کے امیر اور دوسرے ذمّہ دار اصحاب کئی مرتبہ صاف کر چکے ہیں اور اُن کے بارے میں بڑی تفصیل کے ساتھ اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کر چکے ہیں، انہیں بار بار ایک لگے بندھے منصوبے کے تحت بڑی دھوم دھام کے ساتھ عوام کے سامنے لایا جاتا ہے۔ اس کی وجہ کچھ یہ نہیں کہ جو لوگ ان شبہات کو اُبھار اُبھار کر لاتے ہیں وہ اِن شبہات کے بارے میں جماعت کے موقف سے ناواقف ہیں۔ بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح وہ اس تحریک

کے خلاف ملک اور بیرونِ ملک میں ایک معاندانہ فضا تیار کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے اور اس طرح اس کا راستہ روکنا کسی حد تک ممکن ہوگا۔

جوشِ عناد میں یہ حضرات اس بات کو بھول گئے ہیں کہ چند انسانوں کو کچھ وقت کے لیے تو بیوقوف بنایا جا سکتا ہے لیکن اللہ کی ساری مخلوق کو ہمیشہ کے لیے فریب میں مبتلا نہیں رکھا جا سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ ایک متعصب انسان، جسے جماعت سے خدا واسطے کا (بلکہ حقیقت میں شیطان واسطے کا) بیر ہے، اس قسم کی الزام تراشیوں میں اپنی انا کی تسکین کا سامان فراہم کرے، لیکن اس نوعیت کے ہتھکنڈے نہ تو کبھی استعمال کرنے والوں کے لیے مفید اور کارآمد ہوتے ہیں اور نہ ان سے اصل حقائق کو مدتِ دراز تک چھپانے میں کسی فرد یا گروہ کو مدد ملتی ہے۔

ایک ایسی حقیقت جو دن کے اُجالے سے زیادہ واضح اور سُورج سے زیادہ روشن ہے اُسے آخر افترا کے طوفان کب تک لوگوں کی نظروں سے مستور رکھنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں حقیقت جب بھی مکر و فریب کے پردوں کو چاک کرتی ہوئی جلوہ گر ہوتی ہے تو اس سے نہ صرف غلط فہمیوں کے بادل چھٹتے ہیں بلکہ اس قسم کے طوفان اُٹھانے والوں پر سے لوگوں کا اعتماد بھی اُٹھ جاتا ہے اور اس کے بعد وہ اگر کوئی معقول سے معقول بات بھی کرتے ہیں تو لوگ اُسے تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔

گذشتہ بائیس برس میں کونسی غلط فہمی ایسی ہے جو تحریک اور اس کے داعی کے متعلق لوگوں کے دل و دماغ میں پیدا نہیں کی گئی۔ جب یہ تحریک شروع ہوئی تو سیاسی فضا میں یہ لہر اُٹھی کہ اس تحریک کا مقصد انگریزی راج کے ہاتھ مضبوط کرنا ہے لیکن جلد ہی لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ یہ الزام سراسر بے بنیاد ہے۔ جو تحریک باطل کو مٹا کر حق کی فرمانروائی قائم کرنے کا عزم لے کر اٹھی ہو وہ آخر طاغوت کا آلۂ کار کس طرح بن سکتی ہے۔ چنانچہ افترا پردازوں کے اٹھائے ہوئے فتنے کی پہلے مرحلہ پر ہی تردید ہو گئی جب جماعت اسلامی میں شرکت کے لیے یہ اصول بطورِ بنیاد کے طے کیا گیا کہ اس میں جو فرد بھی

شامل ہونے کا ارادہ رکھتا ہے وہ سب سے پہلے نظامِ باطل سے ترکِ تعلق کرے۔ یہ اسی شرط کا نتیجہ تھا کہ بعض حضرات نے جماعت میں شمولیت کی خاطر اچھے خاصے اونچے سرکاری مناصب کو ٹھکرا دیا اور اس معاملے میں کوئی ترغیب و ترہیب ان کے پائے استقلال میں لغزش نہ پیدا کر سکی۔ اس کے بعد یہ شوشہ چھوڑا گیا کہ اس جماعت کے لوگ اپنے سوا کسی کو مسلمان نہیں سمجھتے۔ لیکن رفقاء کے طرزِ عمل نے یہ ثابت کر دیا کہ اس آسمان کے نیچے اس سے بڑا جھوٹ نہیں گھڑا جا سکتا۔ جماعت کے لوگ آخر کہیں آسمان پر تو نہیں رہتے تھے۔ اسی زمین پر انہی بستیوں میں عام مسلمانوں کے ساتھ ہی ان کا رہنا سہنا تھا۔ عام لوگوں نے جب کسی معاملہ میں بھی جماعت کے ارکان و متفقین کو اپنے سے الگ نہ پایا تو وہ مخالفین کے اس الزام کو کیسے صحیح مان لیتے۔ یہی وجہ ہے کہ جماعت جب کوئی کام کرنے اٹھتی ہے تو لاکھوں بندگانِ خدا اس کا ساتھ دیتے ہیں اور مخالفین چیختے رہ جاتے ہیں کہ یہ لوگ تو تمہیں مسلمان نہیں سمجھتے۔

اسی دور میں ایک حلقہ کی طرف سے یہ خدشہ بھی ظاہر ہوا کہ جماعت کا امیر "مجددیت" کا دعویٰ کرنے کے لیے پر تول رہا ہے۔ اس الزام کی اسی وقت تردید کی گئی اور امیرِ جماعت نے ایسے غیر مبہم الفاظ میں اپنی حیثیت کو واضح کیا کہ اس کے بعد اس معاملے میں کسی غلط فہمی کا امکان باقی نہ رہا۔

جماعت اسلامی کے خلاف الزامات کی جو فہرست مختلف اوقات میں تیار ہوتی رہی ہے اس کا مطالعہ بڑا ہی دلچسپ ہے۔ مختلف الزامات موقع و محل کی نزاکت کے مطابق بڑی ہنرمندی اور چابکدستی سے گھڑے جاتے رہے ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ الزام تراشنے والوں نے اس کام میں ایک فن کار کی سی ذہانت اور مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ مثلاً امت کے دین پسند حلقے کے اندر جب یہ احساس بیدار ہوا کہ اس کی فلاح کا راز اس بات میں مضمر ہے کہ یہاں ایک ایسی تنظیم قائم کی جائے جس کی تشکیل خالص اسلامی بنیادوں پر ہو اور جو دین کو نظامِ حیات کی حیثیت سے دنیا میں نافذ کرنے کے لیے جد و جہد کرے، تو اس وقت اس جماعت کے خلاف پروپیگنڈا کی ایک زبردست مہم

اٹھائی گئی اور لوگوں کو یاد کرایا گیا کہ وہ تحریک جسے وہ جماعت اسلامی کے نام سے جانتے ہیں، وہ تو محض ایک سیاسی شعبدہ بازی ہے۔ اس کا دین سے کوئی تعلق نہیں۔ پھر جب جماعت کا سیاسی وزن محسوس کیا جانے لگا اور عوام کے اندر یہ شعور پیدا ہوا کہ کسی با اصول جماعت کے وجود کے بغیر یہ ملک ترقی نہیں کر سکتا تو اس وقت لوگوں کے ذہنوں میں اس غلط خیال کی آبیاری کی جانے لگی کہ یہ تو تنگ نظر مذہبی دیوانوں کا ایک مختصر سا گروہ ہے، یہ بھلا سیاسی میدان میں قوم کی رہنمائی کا فرض کس طرح کامیابی سے ادا کر سکتا ہے۔

یہ ہیں الزامات کے وہ مختصر تیر جن کو مسلسل برسا کر جماعت اسلامی کی پیش قدمی کو روکنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔ یہ محض خدا کا فضل ہے کہ جماعت اسلامی کے "بہی خواہوں" کے یہ سارے وار ناکام رہے ہیں اور اس کے پائے ثبات میں کوئی لغزش پیدا نہیں ہونے پائی۔ اس استقامت کے لیے ہم اللہ تعالیٰ کا جس قدر شکر ادا کریں کم ہے۔

ہمارے ان کرم فرماؤں کے ترکش میں الزامات کے جتنے تیر موجود ہیں ان میں شاید سب سے خطرناک تیر ان حضرات کی نظر میں پاکستان دشمنی کا تیر ہے۔ یہ لوگ غالباً یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ زہر میں بجھے ہوئے اس تیر کو چلا کر وہ جماعت کو ہمیشہ کے لیے موت کے گھاٹ اتار دیں گے۔ اسی بنا پر وہ لوگوں کو اس بات کا قائل کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ جماعت جو سرے سے پاکستان کے وجود ہی کی مخالف رہی ہے، اب پاکستان کی کس طرح خیر خواہ ہو سکتی ہے۔ اس لیے عوام کو کبھی بھی اس پر اعتماد نہ کرنا چاہیے۔

اسے محض ستم ظریفی کہیے کہ اس الزام کے لگانے والوں میں بہت سے ایسے لوگ بھی شامل ہیں جو سرے سے اس نظریہ پر ہی ایمان نہیں رکھتے جسے اس خطۂ پاک کی بنیاد اور اساس کہا جا سکتا ہے یعنی کہ "یہ غم خوار" کھلے بندوں دین اور اس کے شعائر کا مذاق اڑاتے ہیں، ان سارے منکرات کو فروغ

دینے کے درپے ہیں جنہیں اسلام دنیا سے مٹانے آیا تھا اور ان معروفات کا پوری قوت کے ساتھ راستہ روک رہے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ کسی مسلم سوسائٹی میں پھیلانے کی تلقین کرتا ہے۔ دین کے ایک ایک نشان کو یہاں سے محو کرنے کی سازشیں کی جاتی ہیں۔ حتیٰ کہ خود دین کی بنیادوں میں ردوبدل کرکے ایک نیا دین گھڑ ڈالا جاتا ہے لیکن اس کے باوجود یہ حضرات ملک و قوم کے بہی خواہ ہیں اور جو لوگ پاکستان کی بنیاد کے صحیح معنوں میں محافظ اور پاسبان ہیں وہ ملک کے دشمن اور گردن زدنی ہیں۔

ہم یہاں ذاتیات میں اُلجھنا نہیں چاہتے لیکن جو لوگ جماعت اسلامی پر نظریہ پاکستان کی مخالفت کا الزام لگاتے ہیں اُن کی خدمت میں بصد احترام یہ گذارش ہے کہ وہ براہِ کرم اُن اصحاب اقتدار کی وفاداریوں کا جائزہ لیں جن کے ہاتھ میں یہاں مختلف مرحلوں پر اقتدار کی باگیں منتقل ہوتی ہیں، اور پھر خود اندازہ لگائیں کہ قیامِ پاکستان سے قبل یہ حضرات ملّت کے کتنے غمگسار تھے اور اب ملک کے معرضِ وجود میں آجانے کے بعد انہوں نے امّت کی کس قدر خدمت کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اس ملک میں اسلام کے معاملے میں مخلص اور یکسو نہیں وہ پاکستان دوستی کا خواہ کتنا ہی دم بھرتے رہے ہیں لیکن وہ اس ملک کے کبھی حقیقی خیر خواہ ثابت نہیں ہو سکتے۔

آیئے اب یہ دیکھیں کہ تحریکِ پاکستان کا خمیر کن عناصر سے اُٹھایا گیا تھا۔

تحریکِ پاکستان تقسیمِ ملک کا نام نہیں بلکہ احیائے اسلام کی ایک کوشش ہے۔ اس برّ عظیم میں مسلمانوں کے اندر ہمیشہ یہ چُبھتا ہُوا احساس موجود رہا کہ اُن کا نظمِ اجتماعی اُن بنیادوں پر اُستوار نہیں جو اسلام نے انہیں فراہم کی ہیں۔ اُن کی سیاسی اور معاشرتی زندگی اور ان کے افکار و نظریات، اور معتقدات و تصورات کے درمیان بُعد پایا جاتا ہے۔ اس بُعد کو دُور کرنے کے لیے انہوں نے تاریخ کے ہر عہد میں مختلف طریقوں سے جدوجہد کی۔ کبھی یہ تحریک مجدد الف ثانیؒ اور جہانگیر کے درمیان ایک کشمکش کی صورت میں نمایاں ہوئی اور کبھی اس نے شاہ ولی اللہ کی علمی سرگرمیوں

اور تجدیدی کوششوں کا روپ دھارا۔

مسلمانوں کے زوال کے بعد یہ تحریک ایک تسلسل کے ساتھ چلتی رہی۔ اسی تحریک کے زیرِ اثر اُمت کے نامور ائمہ اور صلحاء نے بالا کوٹ میں جانیں دیں۔ اس مقام پر شکست کھا جانے کے بعد پھر اُس نے مختلف تعلیمی اداروں اور دینی مراکز کے اندر پناہ لی اور وہاں سے اپنے اثرات پھیلانے کی کوشش کرتی رہی۔

اِحیائے اسلام کا یہی مقدس جذبہ کبھی الہلال اور البلاغ کا عنوان بنا اور کبھی یہ حالی اور ڈاکٹر اقبال کے حیات آفرین کلام کی صورت میں جلوہ گر ہُوا۔ الغرض مسلمانوں کے اندر کوئی ایسی تحریک نہیں اٹھی جس کے پیچھے یہ جذبہ کارفرما نہ ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کبھی یہ جذبہ ایک ہلکی سی لَے کی طرح بیدار ہُوا، کبھی اس نے زلزلے اور طوفان اٹھائے، کبھی اس نے دلوں کے اندر سوز و گداز پیدا کیا، اور کبھی اس نے علمی سرگرمیوں کی صورت اختیار کی لیکن یہ جذبہ مسلمانوں کی جدوجہد میں بہرحال موجود رہا اور اُمتِ مُسلمہ اسے کبھی نظرانداز نہ کر سکی۔ اُس کے اندر جب کبھی بھی نیا ولولۂ حیات اور جوشِ زندگی پیدا ہُوا تو وہ صرف اسی جذبہ کا اعجاز تھا۔

سوچیے کہ آخر وہ کیا وجہ تھی جس کی بنا پر مسلمان ہندوستانی قومیت اور اس کے فلسفۂ حیات کو اپنی اجتماعی زندگی کے لیے سازگار نہیں پاتے تھے اور اس لیے اپنی علیحدہ قومیت کی تشکیل کے آرزومند تھے۔ اس سوال کا جواب تحریکِ پاکستان کے سب سے اُونچے سربراہ کے الفاظ میں سُنیے:

> "یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ بحیثیت ایک اخلاقی نصب العین اور نظام سیاست اسلام ہی وہ سب سے بڑا جزوِ ترکیبی تھا جس سے مسلمانانِ ہند کی تاریخ حیات متاثر ہوئی۔ اسلام ہی کی بدولت مسلمانوں کے سینے ان جذبات و عواطف سے معمور ہوئے جن پر جماعتوں کی زندگی کا دارومدار ہے اور جن سے متفرق اور منتشر افراد بتدریج متحد ہو کر ایک متمیز و معین قوم کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور اُن کے اندر ایک مخصوص اخلاقی شعور پیدا

پیدا ہو جاتا ہے۔ حقیقت میں یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ دنیا بھر میں شاید ہندوستان ہی ایک ایسا ملک ہے جس میں اسلام کی وحدت خیز قوت کا بہترین اظہار ہوا ہے۔ دوسرے ممالک کی طرح ہندوستان میں بھی اسلامی جماعت کی ترکیب صرف اسلام ہی کی رہین منت ہے کیونکہ اسلامی تمدن کے اندر ایک مخصوص اخلاقی روح کارفرما ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندرونی اتحاد اور اُن کی نمایاں یکسانیت ان قوانین و ادارات کی شرمندۂ احسان ہے جو تہذیب اسلامی سے وابستہ ہیں۔

کیا واقعی مذہب ایک نجی معاملہ ہے اور آپ بھی یہی چاہتے ہیں کہ ایک اخلاقی اور سیاسی نصب العین کی حیثیت سے اسلام کا بھی وہی حشر ہو جو مغرب میں مسیحیت کا ہوا ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم اسلام کو بطور ایک اخلاقی تخیّل کے تو برقرار رکھیں لیکن اس کے نظامِ سیاست کی بجائے ان قومی نظامات کو اختیار کریں جن میں مذہب کی مداخلت کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا؟ یہ دعویٰ کہ مذہبی واردات محض انفرادی اور ذاتی واردات ہیں اہلِ مغرب کی زبان سے تو تعجب خیز معلوم نہیں ہوتا، کیونکہ یورپ کے نزدیک مسیحیت کا تصوّر ہی یہی تھا کہ وہ ایک مشربِ روحانیت ہے جس نے دنیائے مادیات سے منہ موڑ کر اپنی تمام تر توجہ عالمِ روحانیت پر جما لی ہے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے وارداتِ مذہب کی حیثیت، جیسا کہ قرآن پاک میں اُن کا اظہار ہوا ہے، اس سے قطعاً مختلف ہیں۔ یہ محض حیاتی نوع کی واردات نہیں ہیں جن کا تعلق صرف صاحبِ واردات کے اندرونِ ذات سے ہو اور اس کے باہر اس کے گردو پیش کی معاشرت پر ان کا کوئی اثر نہ پڑے۔ برعکس اس کے یہ وہ انفرادی واردات ہیں جن سے بڑے بڑے اجتماعی نظامات کی تخلیق ہوتی ہے اور جس کے اوّلین نتیجے سے ایک ایسے نظامِ سیاست کی تاسیس ہوتی ہے جس کے اندر قانونی تصورات مضمر تھے اور جن کی اہمیت کو محض اس لیے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی بنیاد وحی و الہام پر ہے۔ لہٰذا اسلام کا مذہبی نصب العین اس کے

معاشرتی نظام سے جو خود اس کا پیدا کردہ ہے، الگ نہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم ملزوم ہیں۔ اگر آپ نے ایک کو ترک کیا تو بالآخر دوسرے کا ترک کرنا بھی لازم آئے گا میں نہیں سمجھتا کہ کوئی مسلمان ایک لمحے کے لیے بھی کسی ایسے نظام سیاست پر غور کرنے کے لیے آمادہ ہوگا جو کسی ایسے وطنی یا قومی اصول پر مبنی ہو جو اسلام کے اصول اتحاد کے منافی ہو۔[1]

سیاست کی جڑ انسان کی روحانی زندگی میں ہوتی ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ اسلام ذاتی رائے کا معاملہ نہیں بلکہ وہ ایک سوسائٹی ہے یا پھر یوں کہیے چرچ۔ سیاست میں میری دلچسپی بھی دراصل اسی وجہ سے ہے۔ آج کل ہندوستان کے اندر سیاسی تصورات جو شکل اختیار کر رہے ہیں وہ آگے چل کر اسلام کی ابتدائی ساخت اور نوعیت پر غالباً اثر انداز ہونگے۔ میں یورپ کی وطن پرستی کا مخالف ہوں۔ اس لیے نہیں کہ اگر اُسے ہندوستان میں نشو ونما پانے کا موقع ملے تو مسلمانوں کو مادی فوائد کم حاصل ہونگے۔ میری مخالفت تو اس بنا پر ہے کہ میں اس کے اندر ملحدانہ مادیت پرستی کے بیج دیکھتا ہوں جو میرے نزدیک انسانیت کے لیے ایک عظیم ترین خطرہ ہے۔ حب الوطنی بالکل طبعی صفت ہے اور انسان کی اخلاقی زندگی میں اس کے لیے پوری جگہ ہے۔ لیکن اصل اہمیت اس کے ایمان، اس کی تہذیب اور اس کی روایات کو حاصل ہے۔ اور میری نظر میں یہی اقدار اس قابل ہیں کہ انسان اُن کے لیے زندہ رہے اور اُن ہی کے لیے مرے، نہ زمین کے اس ٹکڑے کے لیے جس سے اس کی روح کو کچھ عارضی ربط پیدا ہو گیا ہے۔[2]

یہ طویل اقتباسات تحریک پاکستان کے مقدمۃ الجیش کے ایک نامور سالار کے ہیں۔ ان کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا ایک جداگانہ قومیت کا اِدّعا اور علیحدہ مملکت کا مطالبہ محض ایک سیاسی و معاشی مطالبہ نہ تھا بلکہ ان کی علیحدگی پسندی کی اصل وجہ صرف یہ تھی کہ وہ اُن

---

[1] حرف اقبال: خطبۂ صدارت آل انڈیا مسلم لیگ - ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء

[2] حرف اقبال: خطبۂ صدارت آل انڈیا مسلم کانفرنس - ۲۱ مارچ ۱۹۳۲ء

اجتماعی تخیلات اور معاشرتی اور سیاسی افکار کو قبول کرنے پر آمادہ نہ تھے جن سے ہندوستانی وطنی تحریک کا مزاج تیار ہوا تھا۔ اس مطالبہ کا اصل محرک مسلمانوں کا یہ شعور اور احساس تھا کہ اسلام ایک مکمل دین اور ایک ضابطۂ حیات ہے۔ اس میں مذہبی زندگی اور اجتماعی زندگی کے درمیان کوئی حدِ فاصل قائم نہیں کی جاسکتی۔ اس لیے بحیثیت مسلمان ان کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ اجتماعی زندگی کی کوئی ایسی شکل گوارا کریں جو اُن کے مذہبی احساسات و تخیلات سے بالکل مغائر ہو۔

یہ ہے تحریکِ پاکستان کی اصل روح جس نے مسلمانوں کے دلوں کو گرمایا اور انہیں بے مثال قربانیاں دینے پر آمادہ کیا۔ اگر مطالبۂ پاکستان صرف سیاسی و معاشی مطالبہ ہوتا تو اس میں وہ مسلمان کبھی شریک نہ ہوتے جنہیں تقسیمِ ملک کے بعد ہندو راج کے تحت زندگی بسر کرنا تھی۔ لیکن دنیا جانتی ہے کہ اسلامی نظامِ حیات کے قیام کی خاطر اُن مسلمانوں نے خود پاکستانی مسلمانوں سے بھی بڑھ کر اس مطالبے کی تائید کی۔ اُن کا احساس یہ تھا کہ نتائج خواہ کچھ بھی ہوں، بہرحال اس نیم برِاعظم کے ایک حصّے میں ایک ایسی تجربہ گاہ کے قائم کرنے میں مدد تو دینی ہی چاہیے جس میں اسلامی تعلیمات کے مطابق مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی تشکیل پاسکے۔ یہ ایک ایسی ٹھوس حقیقت ہے جس سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا۔ چنانچہ دیکھیے کہ جو حضرات کبھی جماعتِ اسلامی کے حامی نہیں رہے بلکہ اس کے سخت نکتہ چین ہیں۔ انہوں نے بھی جب تحریکِ پاکستان کی تشریح کی ہے تو یہی بتایا ہے کہ یہ احیائے اسلام کی ایک کوشش تھی۔ میں یہاں اسی گروہ کے ایک پُرجوش نمائندے کی تصریحات پیش کرتا ہوں

" راجہ صاحب (راجہ محمود آباد) انہیں غیر فعال عناصر کی حمایت میں یہاں تک کہہ گئے ہیں کہ قائداعظم بھی لادینی حکومت قائم کرنے کے متمنی تھے۔ قائداعظم پر اس سے بڑا بہتان تصور میں نہیں آسکتا۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ وہ اکھنڈ بھارت کے تصور کے مؤید تھے کہ دو بڑی اقوام پر ایک غیر نظریاتی اور غیر جانبدار طرزِ حکومت ہی تصرف قائم کرسکتی ہے لیکن جن

لوگوں نے بابائے پاکستان کی تحریریں پڑھی ہیں اور تقریریں سنی ہیں اور ایسے لوگوں کی تعداد اب بھی لاکھوں تک پہنچتی ہو گی کیا وہ کہہ سکتے ہیں کہ پاکستان کی تعبیر سے قائداعظم کا ایک اسلامی مملکت کے قیام کے سوا کچھ اور مقصود تھا؟ یہ تو ہو سکتا ہے کہ قائداعظم حکومت کو ایک خاص اسلامی نہج پر چلانا چاہتے ہوں، اور مجھے یقین ہے وہ نہج جماعت اسلامی کے نظریات سے بالکل مختلف ہوتی، لیکن بہر حال ہوتی اسلامی ـــ فقیہان کرام نے اتنی سادہ بات کو پازندبنا دیا کہ برصغیر میں مسلمانوں نے ایک آزاد مملکت کا خواب اس لیے دیکھا تھا کہ وہ اپنی نجی اور اجتماعی زندگی اپنے اصول ہائے زندگی کے مطابق بسر کر سکیں نہ کہ ہندو اکثریت کے اقتدار اور مطمح نگاہ کے ماتحت و مطابق۔ چونکہ وہ اصول اسلام کے سوتے سے پھوٹتے ہیں اس لیے ان کی قائم کردہ مملکت و حکومت بہر حال اسلامی ہو گی۔

ہر اس مسلمان نے جس نے تحریک پاکستان کی تائید کی اسی نظریے کے ماتحت اور مطابق کی" (مسٹر سلیم احمد نوائے وقت مورخہ ۲۷ مارچ ۱۹۶۳ء)

اب آپ تحریک پاکستان کی مندرجہ بالا تشریح کے بعد جماعت اسلامی کے داعی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تصریحات کا مطالعہ کریں اور دیکھیں کہ کیا وہ اس تحریک کے مخالف تھے۔ ذیل میں اُن کی تحریروں کے چند اقتباسات درج کیے جاتے ہیں جن سے اُن کی "پاکستان دشمنی" کا بآسانی اندازہ کیا جا سکتا ہے:

"اسلام اس قسم کا کوئی مذہب نہیں جو دنیا کی زندگی سے الگ چند معتقدات اور چند مذہبی مراسم انسان کو دیتا ہو تاکہ وہ آخرت کی زندگی میں نجات کے لیے سرٹیفکیٹ کے طور پر کام آئیں۔ بلکہ وہ درحقیقت ایک جامع تہذیب و تمدن ہے جو دنیا کو مزرعۃ الآخرہ (آخرت کی کھیتی) سمجھ کر اور انسان کو زمین میں خلیفۃ الٰہی قرار دے کر زندگی کے جملہ معاملات کی تنظیم کرتا ہے تاکہ انسان اس دنیا میں صحیح برتاؤ کرے اور اس کے نتیجے میں آخرت کی کامیابی سے ہمکنار ہو

اس غرض کے لیے اسلام نے مسلمانوں کو ایک مکمل ضابطہ زندگی دیا ہے، جو دوسرے ضوابطِ زندگی مثلاً اشتمالیت، فاشزم، سرمایہ داری، اور مادیت پرستی وغیرہ سے بالکل مختلف صورت میں اُن کے نظامِ اجتماعی کی تشکیل کرتا ہے اور ان کو علوم و آداب میں، اخلاق و معاملات میں، عادات و اطوار میں، تمدن و معاشرت میں معیشت و سیاست میں غرض زندگی کے ہر شعبے میں بعض طریقوں کو ترک اور بعض کو اختیار کرنے کی ہدایت کرتا ہے۔ اس ضابطہ کی اساس ایک خاص طریقہ فکر اور ایک خاص مقصدِ حیات پر رکھی گئی ہے جو دوسری قوموں اور تہذیبوں کے طریقِ فکر و مقصدِ حیات سے بالکل مختلف ہے، جس کی رُو سے اشیاء کی قدریں دوسری تہذیبوں کی پسند کی ہوئی قدروں سے بالکل مختلف طور پر معیّن ہوتی ہیں، اور جس کے لحاظ سے زندگی میں مسلمان اپنا راستہ دوسروں کے انتخاب کیے ہوئے راستوں سے الگ انتخاب کرتا ہے۔

ہر تہذیب کی طرح اس تہذیب کے بقا اور فروغ کا انحصار بھی دو چیزوں پر ہے۔ ایک یہ کہ مسلمانوں کا نظامِ تعلیم ایسا ہو جو ان کے دل و دماغ میں اسلام کے طریقِ فکر اور مقصدِ حیات کو صحیح طور پر پیوست کر دے اور ان کو اس قابل بنائے کہ وہ مسلمان کی حیثیت سے سوچیں اور اسلام کے بتائے ہوئے معیار کے مطابق زندگی کے ہر دوراہے پر ایک خاص راستے کا انتخاب کریں۔ دوسرے یہ کہ یہ نظامِ تہذیب اپنی صحیح صورت میں عملاً قائم ہو، اجتماعی زندگی میں اس کے اصول عملاً رائج ہوں اور ایک ایسا ماحول بن جائے جس میں مسلمان خود بخود اسلامی اصولوں پر زندگی بسر کر سکیں۔ اس غرض کے لیے مسلمانوں کے پاس سیاسی طاقت کا ہونا ضروری ہے، کیونکہ کوئی سوسائٹی سیاسی طاقت کے بغیر اپنی مخصوص ہیئت کی حفاظت نہیں کر سکتی۔"

(مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ اول صفحہ ۱۰۷)

مولانا محترم کانگرس کی وطنی تحریک پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"یہ قوم پرستی کی تحریک، جس کے تحت اس وقت آزادئ وطن کے نام پر جنگ کی جا رہی ہے۔

درحقیقت ہم کو اپنے اس قومی مقصد کی تحصیل میں مدد نہیں دیتی بلکہ اس کے برعکس ان نقصانات کو حدِ کمال پر پہنچانا چاہتی ہے جو ہم کو انگریزی اقتدار سے پہنچے ہیں۔ ڈیڑھ سو برس تک ایک غیر قوم کی غلامی میں رہنے کی وجہ سے ہماری قوم میں جہالت، افلاس، اخلاقی انحطاط، اجتماعی بدنظمی، تمدنی بے راہ روی اور تہذیبِ اسلامی سے انحراف کی جتنی خرابیاں پیدا ہوئی ہیں، انہیں دُور کرنے میں ہماری مدد کرنا تو درکنار، وہ تو آن سے اُلٹا فائدہ اٹھانا چاہتی ہے اور ہماری ان اندرونی خرابیوں ہی کو اپنے لیے کامیابی کا ذریعہ سمجھتی ہے۔ ایک طرف اس تحریک کے علمبردار اپنا زور اس بات پر صرف کر رہے ہیں کہ جمہور مسلمین کے دلوں سے اسلامی قومیت کا تخیل ہی مٹ جائے اور وہ اپنی قومیت کے رشتہ سے کٹ کر معاشی طبقوں میں منقسم ہو جائیں اور آپس میں روٹیوں پر لڑنا شروع کر دیں۔ دوسری طرف ان لوگوں کے پاس تہذیب و تمدن اور تنظیمِ حیات کے متعلق خود اپنے نظریات موجود ہیں جو اسلام کے اصولوں سے بالکل مختلف ہیں اور وہ مسلمانوں کی اجتماعی مزاحمت سے بے خوف ہو کر یہ چاہتے ہیں کہ تمام ہندوستان کی اجتماعی زندگی کو انہی نظریات کے تحت مرتب کر دیں جس کی لپیٹ میں مسلمان بھی آجائیں۔ اس طرح یہ تحریک ہمارے قومی مقاصد کے بالکل خلاف واقع ہوتی ہے اور اس کے ساتھ شریک ہونے کے معنی یہ ہیں کہ ہم اپنی قومیت اور اپنی تہذیب کو نیست و نابود کرنے میں خود حصہ لیں۔ وہ اپنے پروپیگنڈا کی طاقت سے یہ خیال پھیلا رہے ہیں کہ جو لوگ ان کی اس تحریک سے اختلاف کرتے ہیں وہ انگریزی اقتدار کے حامی ہیں ٹوڈی اور سامراج پرست ہیں۔ لیکن یہ ایک زبردست جعل و فریب ہے جس کو دن کی روشنی میں فروغ دیا جا رہا ہے۔ دراصل سب سے بڑا ٹوڈی اور سامراج پرست تو وہ ہے جو وطن کی نجات کے لیے ایسے طریقے اختیار کرتا ہے جن سے وطن کی ۱/۴ آبادی کسی طرح اتفاق نہیں کر سکتی۔ اپنی اس حماقت سے وہ خود انگریزی اقتدار کے قیام و بقا میں مدد دیتا ہے اور پھر اس حماقت کا الزام ان لوگوں پر رکھتا ہے جو نجاتِ وطن کے لیے سرفروشی کرنے پر تیار ہیں مگر اپنی قومیت اور اپنی قومی تہذیب کو فنا کرنے پر فطرۃً تیار نہیں ہو سکتے۔" (مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ اول)

پھر مولانا نے وطنی تحریک کا صرف تجزیہ کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ ۱۹۳۶ء میں انہوں نے مسلمانوں کے تہذیبی ورثہ کو بچانے اور اسلام کے احیاء کے لیے بعض ٹھوس تجویزیں بھی پیش کی تھیں۔ اگر ان تجاویز کا تفصیل کے ساتھ مطالعہ مقصود ہو تو براہِ کرم "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصّہ دوم" کے آخری حصّے کا مطالعہ فرمائیے اور پھر خود اندازہ لگائیے کہ کیا اس شخص کی مومنانہ بصیرت نے حالات کا صحیح جائزہ لیکر مسلمانوں کو بروقت رہنمائی نہیں دی۔ اس سلسلہ میں مولانا نے جو تجاویز پیش کیں اُن کے بعض حصّوں کو ہم یہاں درج کرتے ہیں:

"مختلف قوموں کے الگ الگ حدودِ اراضی مقرر کر دیئے جائیں جہاں وہ اپنے جمہوری اسٹیٹ بنا سکیں۔ پچیس سال یا اس سے کچھ کم و بیش مدت تبادلہ آبادی کے لیے مقرر کر دی جائے۔ ہر اسٹیٹ کو زیادہ سے زیادہ اندرونی خود مختاری دی جائے اور وفاقی مرکز کے اختیارات کم از کم رکھے جائیں۔"

اگر یہ صورت بھی منظور نہ ہو تو پھر مجبوراً ہم یہ مطالبہ کریں گے کہ ہماری قومی ریاستیں الگ بنائی جائیں اور اُن کا علیحدہ وفاق ہو، اسی طرح ہندو ریاستوں کا بھی ایک جُداگانہ وفاق ہو، اور پھر ان دو یا زائد وفاقی مملکتوں کے درمیان ایک طرح کا تحالف (CONFEDERACY) ہو جائے۔ جس میں مخصوص اغراض، مثلاً دفاع اور مواصلات اور تجارتی تعلقات کے لیے مقررہ شرائط پر تعاون ہو سکے۔" (مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصّہ دوم ۲۱۳-۲۱۴)

یہ تحریر اُس زمانے کی ہے جبکہ ابھی مسلم لیگ نے پاکستان کے مطالبے کا فیصلہ بھی نہیں کیا تھا۔

مولانا کی یہ تجاویز اپنی نوعیت اور مزاج کے اعتبار سے اُن تجاویز سے ملتی جلتی ہیں جو کئی سال بعد کیبنٹ مشن نے کانگرس اور لیگ کے سامنے پیش کیں اور جنہیں مسلم لیگ بادلِ ناخواستہ ہی سہی، بہر حال قبول کرنے پر آمادہ ہو گئی تھی۔ لیگ کی یہ آمادگی اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ تقسیم ملک درحقیقت تحریک پاکستان نہ تھی۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو پھر مسلم لیگ تقسیم کے علاوہ کسی دوسرے راستہ پر غور کرنے کے لیے بھی اپنے آپ کو تیار نہ پاتی۔ کیبنٹ مشن کی کارروائیوں کی جو تفصیلات ہمارے سامنے آئی ہیں

اُن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تقسیم کے علاوہ کچھ دوسرے متبادل راستوں پر بھی غور کیا گیا اور مسلم لیگ نے اُن میں سے ایک کو قبول کر لیا۔ لیکن پنڈت نہرو کے غیر ذمہ دارانہ بیان کی وجہ سے حالات نے ایک ایسی کروٹ لی جس سے مسلم لیگ نے ان تجاویز کو پھر رد کر دیا۔

کیبنٹ مشن کی تجویز یہ تھی کہ ملک کا دفاع، امورِ خارجہ اور ذرائع آمد و رفت مرکزی حکومت کی تحویل میں دے دیئے جائیں اور باقی معاملات میں صوبوں کو خود مختاری حاصل ہو۔ اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کی غرض سے پورے ملک کو تین منطقوں میں تقسیم کیا گیا، ایک ہندو اکثریت کا منطقہ، دوسرا مسلم اکثریت کا منطقہ، جس میں پنجاب، سندھ، شمال مغربی سرحدی صوبہ اور بلوچستان شامل تھے اور تیسرا بنگال اور آسام جس میں مسلمانوں کو معمولی اکثریت حاصل تھی۔ مشن نے یہ طے کیا کہ جن منطقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اُن میں انہیں دفاع، امورِ خارجہ اور ذرائع آمد و رفت کے سوا ہر معاملے میں مکمل خود مختاری حاصل ہو۔

ان تجاویز پر غور کرنے کے لیے مسلم لیگ کی مجلسِ عاملہ کا تین دن اجلاس ہوتا رہا اور بالآخر انہیں قبول کر لیا گیا۔ یہ قبولیت جس طرح انکار میں تبدیل ہوئی اُسے مولانا ابُو الکلام آزاد نے اپنی کتاب آزادیٔ ہند میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

> "اب ایک ایسا افسوسناک واقعہ پیش آیا جس نے تاریخ کے دھارے کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے دس جولائی کو بمبئی میں ایک پریس کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے ایسی بات کہہ دی جو شاید عام حالات میں قطعاً توجہ کی مرکز نہ بنتی۔ لیکن نفرت اور بے اعتمادی کی مسموم فضا میں جو ہندوستان میں اُس وقت چھائی ہوئی تھی، اُس نے نہایت ہی تشویشناک نتائج پیدا کیے۔ کسی پریس کے نمائندے نے پنڈت جی سے دریافت کیا کہ کیا کانگرس کی مجلسِ عاملہ کے ریزولیشن کا مطلب یہ ہے کہ کانگرس نے کیبنٹ مشن کی تجاویز کو من و عن قبول کر لیا ہے۔ اس پر پنڈت جواہر لال نے کہا کہ کانگرس مجلس قانون ساز میں

معاہدات کی پابند ہو کر نہیں بلکہ پوری آزادی کے ساتھ شریک ہوتی ہے اور حالات سے
نبرد آزما ہونے کے لیے جو روش چاہیے اختیار کر سکتی ہے۔

پنڈت جی کی زبان سے یہ جواب سن کر پریس کے نمائندے نے پھر دریافت کیا کہ کیا
اس کا مطلب یہ ہے کہ کیبنٹ مشن کی تجاویز میں ترامیم ہو سکتی ہیں۔ اس پر پنڈت جی نے
بڑے زور کے ساتھ یہ کہا کہ کانگرس صرف مجلس قانون ساز میں شرکت پر رضامند ہوئی ہے
لیکن وہ کیبنٹ مشن کی تجاویز میں ترمیم یا ردّ و بدل کرنے میں اپنے آپ کو آزاد سمجھتی ہے۔

پنڈت نہرو کا یہ بیان سراسر غلط تھا۔ . . کیبنٹ مشن کی تجاویز کو کانگرس خود اپنی
مرضی سے دوسری پارٹیوں کی رضامندی کے بغیر تبدیل کرنے کی کسی طرح مجاز نہ تھی۔

پنڈت جی کے اس بیان نے لیگ کے ہائی کمانڈ کو سخت مضطرب کیا۔ چنانچہ فوراً
اخبارات کے نام بیان جاری کیا گیا کہ کانگرس کے صدر کا یہ اعلان اس بات کا متقاضی ہے
کہ حالات کا از سرِ نو جائزہ لیا جائے۔ . . . اب جبکہ کانگرس کے صدر کی طرف سے
یہ کہا جا رہا ہے کہ کانگرس مجلسِ دستور ساز میں اپنی اکثریت کے بل بوتے پر مشن کی سکیم کو
تبدیل کرنے کی مجاز ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اقلیتیں اکثریت کے رحم و کرم پر ہیں۔
مسٹر جناح کا خیال یہ تھا کہ جواہر لال کا یہ اعلان اس حقیقت پر دلالت کرتا ہے کہ کانگرس
نے کیبنٹ مشن کی تجاویز کو مسترد کر دیا ہے۔ چنانچہ ۲۷ جولائی کو بمبئی میں مسلم لیگ کونسل کا
اجلاس بلایا گیا۔ مسٹر جناح نے اپنی افتتاحی تقریر میں مطالبۂ پاکستان کو دہرایا اور کہا کہ اس
ایک راہ کے سوا مسلم لیگ کو کوئی دوسری راہ نظر نہیں آتی۔ تین دن کی بحث و تمحیص کے بعد
کیبنٹ مشن کے پلان کو رد کر دیا گیا۔" (انڈیا ونز فریڈم ۱۵۴-۱۵۵)

یہ تفصیلات کسی مبالغہ آمیزی پر مبنی نہیں ہیں۔ لیگ کی قراردادیں اُن کی پوری طرح تائید کرتی ہیں۔
ان کو دیکھنے سے یہ بات اچھی طرح منکشف ہو جاتی ہے کہ تحریکِ پاکستان کا اصل مقصد تقسیم ملک نہ تھا
(باقی صفحہ ۹۶ پر)

(بقیّہ اشارات)

بلکہ اس کا حقیقی نصب العین اسلام کا احیاء تھا اور اس وجہ سے جب کبھی کوئی ایسی متبادل صورت سامنے آئی جس سے مسلمانوں کی تہذیب اور ان کی روایات کی حفاظت و پاسبانی ممکن ہوتی تو اسے اس مقصد کے وسیع تر مفاد کے پیشِ نظر قبول کر لیا گیا۔

خدا کا شکر ہے کہ ہم ان لوگوں میں نہیں جو حالات کے بدلتے ہوئے تیور دیکھ کر نہ صرف حال کو بلکہ ماضی کو بھی تبدیل کر دیتے ہیں ہم اس بات کا کھلے بندوں اعتراف کرتے ہیں کہ تقسیمِ ملک کی جنگ سے ہم غیر متعلق رہے ہیں۔ اس کارکردگی کا سہرا ہم صرف مسلم لیگ کے سر باندھتے ہیں اور اس میدان میں کسی حصّے کا اپنے آپ کو دعویدار نہیں سمجھتے لیکن یہ بات پورے وثوق سے کہتے ہیں کہ تحریکِ پاکستان دراصل احیائے اسلام کی تحریک تھی اور تقسیمِ ملک کی کوشش اس مقصد کے حصول کا صرف ایک ذریعہ تھا۔ دوسرے لوگوں نے اس ذریعہ کے علاوہ اگر اسی مقصدِ عظیم کے لیے کسی اور طریقے پر کام کیا ہو تو انہیں تحریکِ پاکستان کا دشمن قرار دینا صریح زیادتی ہے۔ اگر تقسیمِ ملک کے علاوہ کسی دوسری متبادل صورت کو پیش کرنا یا قبول کرنا مسلمانوں سے غدّاری تھی تو اس جرم کا

ارتکاب تنہا جماعت اسلامی ہی نے نہیں کیا بلکہ قیام پاکستان سے عین پہلے تک مسلم لیگ نے بھی کیا ہے جسے تحریکِ پاکستان کی بلا شرکتِ غیرے اجارہ داری کا دعویٰ ہے۔

اب جبکہ پاکستان قائم ہو چکا ہے ہم اس قسم کی بحثوں کو بیکار سمجھتے ہیں اور دل سے اس بات کے آرزو مند ہیں کہ یہ خطۂ پاک اسلام کا گہوارہ بنے اور اس میں مسلمان اپنی امنگوں اور آرزوؤں کی عملی تعبیر دیکھ سکیں۔ یہ ملک اسلام کی تجربہ گاہ ہو۔ یہ بھٹکی ہوئی انسانیت کے لیے مینارِ نور ثابت ہو۔ یہاں سے اسلام کے سرمدی چشمے پھوٹیں اور نوعِ بشری کی روحانی پیاس کو بجھانے کا ذریعہ بنیں۔ اس ملک کا استحکام ہمارا ایمان ہے اور اس کی خدمت کو ہم صرف دنیوی سربلندی کا ذریعہ نہیں سمجھتے بلکہ آخرت کی فلاح و کامرانی کا وسیلہ بھی خیال کرتے ہیں۔

ہم نے یہ تلخ باتیں بڑی مجبوری کے عالم میں کی ہیں۔ ان کا مقصد نہ تو کسی کی تضحیک ہے اور نہ تذلیل۔ ہم صرف اصل حالات سے عوام کو آگاہ کرنا چاہتے ہیں تاکہ آئے دن ہمارے خلاف جو غلط فہمیاں پھیلائی جاتی ہیں ان سے وہ بچ سکیں۔

پندرہ روزہ "الحسنات" رام پور — کے

پاکستانی خریداروں کے لیے آسانی

پندرہ روزہ الحسنات رام پور اپنی آسان زبان اور دینی مزاج رکھنے والے مضامین کی وجہ سے گزشتہ سولہ سال سے ہند و پاکستان میں بہت زیادہ مقبول رہا ہے۔ دونوں ملکوں کے درمیان زرِ مبادلہ کی دشواریوں سے بچنے کے لیے ہم نے مندرجہ ذیل ایجنسی سے معاملہ کر لیا ہے۔ پاکستانی حضرات ۲۰-۶ (چھ روپے بیس پیسے) اس پتہ پر بھیج کر سالانہ خریدار بن سکتے ہیں:

پیرا ڈائز سبسکرپشن ایجنسی۔ بونس روڈ، نزد ریو سینما کراچی ۲

براہِ کرم کوپن پر وضاحت سے لکھیں کہ یہ الحسنات رامپور کا چندہ ہے۔ رقم بھیجنے کے ساتھ ایک پوسٹ کارڈ کے ذریعہ ہمیں بھی مطلع فرمائیں — منیجر مکتبہ "الحسنات" رام پور۔ یو پی